محمد حنیف ندوی

# تاثرات

## احیائے اسلام کے فکری و عملی تقاضے

(۹)

پاکستان بن جانے کے بعد جس مسئلہ نے اہل فکر کی توجہات کو خصوصیت سے گھیر رکھا ہے وہ یہ ہے کہ ہماری تہذیب کیا ہے؟ ہمارے تمدن کے ممیزات اور خدوخال کیا ہیں اور زندگی کا وہ کونسا نقشہ ہے جسے ہمیں اپنانا چاہیے؟ زیادہ واضح لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اصل اور بنیادی سوال یہ ہے کہ ہماری تہذیبی اقدار کی تعیین کے لیے کیا اصول کارفرما ہونے چاہئیں؟

ایک طرف تو اس مسئلہ کی اہمیت کا یہ عالم ہے کہ اس کے بغیر نہ تو صحیح معنوں میں اسلام کے مضمرات اجتماعی کا اس دور میں اظہار ممکن ہے، نہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل کا نصب العین پروان چڑھتا ہے، اور نہ ہم اس لائق ہی ہو پاتے ہیں کہ مسلمان کی حیثیت سے زندگی کی تگ و دو میں فخر کے ساتھ حصہ لے سکیں۔ دوسری طرف تغافل اور سہل انگاری کا یہ حال ہے کہ ایک عرصہ سے ہم نے یہی طے نہیں کیا کہ ہماری تہذیبی منزل کیا ہے؟ ہمیں کیا اخذ کرنا ہے، کیا چھوڑنا ہے۔ کہاں جھکنا اور کہاں دوسروں کو جھکانا ہے۔ یعنی بحیثیت مجموعی ہمیں کس نوع کی زندگی بسر کرنا ہے اور اسلامی تعلیمات کی روشنی میں کن خطوط پر تہذیب و تمدن کے حسین مرقعوں کو ترتیب دینا ہے۔

اس میں کچھ شبہ نہیں کہ سرسید نے مشترکہ ہندیں اوّل اوّل اس مسئلہ کی نزاکت کو پوری طرح محسوس کیا، اور شدت سے محسوس کیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان کی تمام تر کاوشیں اخلاص اور اسلام دوستی پر مبنی تھیں۔ وہ مسلمانوں کو سربلند، اونچا اور مہذب دیکھنا چاہتے تھے۔ لیکن فکر و نظر کا نہج چونکہ معذرت خواہانہ ( APologetie ) تھا، اس لیے تہذیب اسلامی کے اصلی نقوش

ابھارنے میں ناکام رہے اور بجز اس کے اور کچھ نہ کر سکے کہ اقوامِ مغرب کی ترقیاتِ روز افزوں کا ہمیں ساتھ دینا چاہیے۔ اس کے برعکس اکبر کے چٹکلوں اور شعری لطیفوں نے تہذیبِ مغربی پر بھرپور وار کیے اور بتایا کہ بلند بانگ دعاوی کے باوجود اس میں کس درجہ کھوکھلاپن ہے کتنی سطحیت ہے اور یہ کہ ہمارے ذوق اور مزاج اور مغرب کے ذوق و مزاج میں اقدار و اخلاق کا کتنا بڑا تفاوت ہے۔

اقبال نے اس سلسلہ میں صحیح معنوں میں ایک مثبت اور حکیمانہ قدم اٹھایا اور فلسفہ و دانش کے پُروقار لب و لہجہ میں نئی نسل کے قلب و ذہن میں اس حقیقت کو اتارنے کی کوشش کی کہ اسلام کا اپنا ایک جاندار تہذیبی تصوّر ہے، اپنی تہذیبی اقدار ہیں اور اپنا ایک تمدنی سانچہ ہے۔ جس میں وہ پوری دنیائے انسانیت کو ڈھالنا چاہتا ہے۔

سرسیّد کا تہذیبی نظریہ اگرچہ صحیح نہ تھا تاہم دل میں چونکہ اخلاص اور دردمندی کے جذبات موج زن تھے اس لیے ان کی کوششیں اس حد تک ضرور کامیاب ہوئیں کہ مسلمانوں نے تعلیم میں اچھی خاصی ترقی کی اور اونچی ملازمتوں کے حصول میں ابنائے وطن سے پیچھے نہیں رہے۔ اکبر کی شاعری میں استدلال سے زیادہ ادب و مزاح کی چاشنی تھی اس لیے اہلِ ذوق اس سے محظوظ تو ہوئے اور ان میں ذہن و فکر کی حد تک اپنی انفرادیت کا احساس بھی ابھرا۔ مگر اس سے مثبت روشنی نہ حاصل ہو سکی اور تہذیب و تمدن کی پیچیدہ گرہوں کو کھولنے میں معتدبہ مدد نہ مل سکی۔ موجودہ پود کو اقبال کا شکر گذار ہونا چاہیے کہ اسلام کی تہذیبی روح کو انھوں نے اپنے پیغام میں ایسی دلآویزی سے سمو کر پیش کیا کہ دل و دماغ پر اس نے گہرے نقوش چھوڑے۔ یہی نہیں اس سے عصرِ حاضر کی سیمیائی اور تہذیبِ جدید کی فسوں کاری کو شدید زک پہنچی۔ حقیقت یہ ہے کہ رومی کے بعد اقبال وہ پہلا متکلم اور فلسفی شاعر ہے جس کی صدائے دلنواز نے اکھڑے ہوئے دلوں کو پھر سے اسلامی عقائد و تصوّرات پر جمایا اور اسلام کے ساتھ وابستگی و تعلق کی نوعیتوں کو از سرِ نو استواری بخشی۔ لیکن اس پر بھی اصل سوال جوں کا توں لاینحل رہا۔ تعلیم کے ارتقاء

صنعت کے فروغ اور ٹیکنالوجی کی بدعت طرازیوں نے معاشرہ میں جو تبدیلیاں پیدا کر دی ہیں، اور جس نہج سے نئے نئے مسائل اور نئی نئی مشکلات کو ابھار دیا ہے، غور طلب چیز یہ ہے کہ اس کے مقابلہ میں اسلامی فکر اور اسلامی تہذیب کا موقف کیا ہے؟ کیا ہمیں اس تہذیب کو من و عن بغیر کسی شرط و احتساب کے قبول کر لینا چاہیے یا اس کے صرف انھیں پہلوؤں کو اپنانا چاہیے جو صحت مند، ترقی پذیر اور باقی رہنے والے ہیں۔ اس سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر دو ٹوک اور بنیادی سوال یہ ہے کہ ہمارے اپنے تہذیبی پیمانے کیا ہیں؟ یعنی ہم اگر عصر حاضر کی تہذیب کو نقد و جرح کا ہدف ٹھہرانا چاہتے ہیں اور یہ دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں کیا خراب، غیر صحیح اور غیر مفید ہے تو کن تہذیبی اصولوں کی روشنی میں اور کیوں؟

اپنے تہذیبی پیمانوں کی تعیین اس بنا پر ضروری ہے کہ اس کے بغیر ہم نئی اسلامی تہذیب کی تخلیق نہیں کر سکتے۔ یہ اصول اپنی جگہ صحیح ہے کہ ہر ہر تہذیب ناقص ہے، متحرک ہے اور تغیر و تبدل کو بخوشی قبول کر لینے پر آمادہ ہے۔ یہ بھی صحیح ہے کہ اخذ و رد کا اصول قوموں میں خود بخود، بغیر اس کے کہ کوئی اس کی رہنمائی کرے، جاری اور کارفرما ہے۔ اس لیے اگر ہم کچھ اصول یا معیار متعین نہ کریں، اور تہذیب و تمدن کے دھاروں کو اپنے انداز سے بہنے دیں۔ جب بھی اس میں پیوند کاری کا عمل بہرحال قائم رہے گا۔ لیکن اس صورت میں تہذیب کا جو نقشہ بنے گا اور زندگی کے رواں دواں قافلے جو نہج اختیار کریں گے ہم ان پر اسلام کا لیبل چسپاں نہیں کر سکیں گے۔ مزید برآں ایک اہم نکتہ اس سلسلہ میں سمجھنے کا یہ ہے کہ اسلامی تہذیب سے ہمارا مقصود یہ نہیں ہے کہ ہم تہذیب حاضر کا جائزہ لیں اور اس میں کچھ پہلوؤں کو گوارا یا خوشگوار سمجھ کر اپنے فکر و عمل کا جز بنا لیں۔ ہمارے ذہن میں اسلامی تہذیب کے بارہ میں یہ تصور ہے کہ اس کا کام امتزاج و ترکیب سے کہیں زیادہ تخلیق و ابداع ہے یعنی ہمیں زندگی کے ہنگاموں کو از سر نو ترتیب دینا ہے، انھیں ایک انوکھا امتزاج بخشنا ہے، اور ایک بالکل ہی نئی روح پھونکنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں اس

دبستانِ حیات کو اس طرح سجانا اور مٹکانا ہے کہ اس کی شمیم آرائیاں جسم کے ساتھ ساتھ روح کو بھی معطر کر سکیں۔

کہنا یہ ہے کہ محض تقلید سے یا تھوڑے سے ردّ و بدل سے جدید علم الکلام کے تہذیبی تقاضے پورے ہونے والے نہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اس دَور کے مجتہدین تعیین کے ساتھ ان تہذیبی پیمانوں کی نشاندہی کریں کہ جو اسلامی تہذیب کی تخلیق میں فی الحقیقت مدد دے سکیں یا جن کے بل پر اسلامی تہذیب کی طرفہ طرازیاں ایک صحیح اسلامی معاشرہ کی تشکیل کر سکیں۔